© rasailojaraid.com

RAYAZ AHMED SHERIFF
25/9, MARAPPA THOTA
M. R. PALYAM, BANGALORE

تحقیق وتنقید

تصوّف اور شیعیت

ڈاکٹر محمد زکی

تصوف کا رشتہ شیعیت اور باطنیت سے جوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ مقالہ بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس نقطہ نظر کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اس مقالہ کو اسی پہلو سے کسی تائید یا تردید کے بغیر ان صفحات میں پیش کیا جارہا ہے۔ اہل علم سے توجہ کی درخواست ہے ——— (جلال الدین)

تصوف پر اس میں شک نہیں بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور اس کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی بحث بھی ہو چکی ہے۔ لیکن اس کے ایک بہت ہی اہم پہلو پر ابھی تک خاص توجہ نہیں دی گئی اور وہ ہے تصوف اور شیعیت کا باہمی تعلق، یعنی تصوف اپنے ارتقائی دور میں شیعیت سے کس حد تک متاثر ہوا ہے اور اس کے وہ کون کون سے اصول ہیں جو شیعہ مذہب سے ماخوذ ہیں۔ اس سلسلے میں اگر ان دونوں تحریکوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو امید ہے اس سے تصوف کی حقیقت کو سمجھنے اور اس کے بارے میں ایک متوازن رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی۔

تصوّف اصلاً ایک شیعی تحریک

یہ بات یقیناً بہت سے لوگوں کے لیے چونکا دینے والی ہوگی کہ تصوف کو شیعیت ہی نے جنم دیا ہے اور اس کی پرورش اور تربیت بھی شیعیت کے آغوش میں ہوئی ہے۔ یہ قیاس آرائی ہے نہ کوئی الزام بلکہ وہ تاریخی شہادت ہے جو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (دائرۂ معارف اسلامیہ) میں موجود ہے اور مستند ماخذ کے حوالوں کے ساتھ اس طرح دی گئی ہے:

الصوفی کو لقب کے طور پر تاریخ میں پہلے پہل آٹھویں صدی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے نصف آخر میں کوفے کے ایک شیعہ کیمیا گر جابر بن حیان کے نام کے ساتھ، جو زہد میں ایک مسلک خاص رکھتا تھا۔ استعمال کیا گیا د قب خشیش نسائی، م۔ ۲۵۳ھ [۸۶۷ء] : استقامہ، بذیل کلمہ) نیز ایک نامور صوفی ابو ہاشم کوفی کے نام کے ساتھ۔

اس کا صیغہ جمع صوفیہ پہلی دفع ۱۹۹ھ/۸۱۴ء میں اسکندریہ کی ایک معمولی سی شورش کے سلسلے میں نظر آتا ہے (الکندی: قضاۃ مصر، طبع گسٹ Guest ص ۱۶۲ و ۴۴۰) محاسبی (مکاسب، فارسی مخطوطہ، ص ۸۴) اور جاحظ (بیان [قاہرہ ۱۳۳۲ھ] ۱: ۱۹۵) کے مطابق، تقریباً اسی زمانے میں اس کا استعمال نیم شیعی مسلمانوں کی ایک جماعت صوفیہ کے لیے ہوا تھا۔ جو کوفے میں پیدا ہوئی اور جس کا آخری امام عبدک الصوفی تھا، یہ شخص نبات خور اور تارک اللحم اور خلافت میں حق ارث کا قائل تھا اور تقریباً ۲۱۰ھ/۸۲۵ء میں بغداد میں فوت ہوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ابتداء میں صوفی کا لفظ کوفے ہی تک محدود تھا۔

اس اصطلاح کی قسمت میں ایک شاندار مستقبل تھا، چنانچہ پچاس سال کے اندر یہ لفظ (خراسان کے ملامتیہ متصوفین کے مقابلے میں) تمام عراقی متصوفین کے لیے استعمال ہونے لگا اور دو صدی بعد صوفیہ کی اصطلاح جملہ مسلمان متصوفین کے لیے اسی طرح استعمال ہونے لگی جس طرح آج کل ہم صوفی اور تصوف کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ (ص ۴۱۹)

اس تاریخی شہادت سے یہ امر بالکل واضح ہے کہ سب سے پہلا صوفی ایک شیعہ تھا، ابتدا میں صوفیہ کا اطلاق ایک نیم شیعہ فرقے پر ہی ہوا ہے، تقریباً ایک صدی تک تصوف کی تحریک شیعیت کے گہوارے کوفے میں پروان چڑھتی رہی ہے اور یہ کہ سنی بزرگ کافی عرصے کے بعد اس تحریک سے منسلک ہوئے ہیں۔

تصوّف کا نقش اوّل

آئیے دیکھیں تصوف کی ابتدائی شکل کیا تھی یعنی سب سے پہلے صوفی جابر بن حیان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے کیا عقائد و نظریات تھے؟

اس شخص کا پورا نام جابر بن حیّان الکوفی الصوفی (۱۲۰ھ/۷۳۷ء — ۱۹۸ھ/۸۱۳ء) ہے۔ اس کا بڑا وسیع مطالعہ تھا اور اس نے مختلف علوم مثلاً کیمیا، فلسفے، فلکیات، نجوم، ریاضیات، موسیقی، طب، سحر اور علوم باطنی پر متعدد کتابیں اور رسالے لکھے ہیں۔ ان تصانیف کی روشنی میں اس کے عقاید و افکار کا جو تجزیہ کیا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

> جس طرح قدیم کیمیاگر اپنے فن کی اساس مسیحی ادریت (باطنی علم یا مذاہب عرفان) پر رکھتے تھے اسی طرح جابر نے اپنے نظامِ علوم کی بنا مسلمانوں کے باطنی علم یا عرفان پر رکھی ہے لیکن یہ وہ ابتدائی عرفان و باطنی علم نہیں جس کا نشو و نما پہلی اور دوسری صدی ہجری (۷ ویں اور ۸ ویں صدی عیسوی) میں ہوا تھا بلکہ وہ باطنی علم و عرفان ہے جس کا ظہور غالی شیعوں میں تیسری صدی ہجری (۹ ویں صدی عیسوی) کے آخر میں ہوا تھا اور جس نے سیاسی انقلابی رجحانات کے ساتھ مل کر اسلام کے وجود ہی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔

جابر کا کہنا تھا کہ عنقریب ایک نیا امام ظاہر ہوگا جو اسلامی قانون کو منسوخ کر دے گا اور قرآن کی جگہ یونانی فلسفے اور سائنس کو رائج کرے گا۔

جابر نے تاریخِ عالم کی تقسیم باعتبار سلسلۂ وحی کی ہے جس کا ظہور بقول اس کے یکے بعد دیگرے سات مرحلوں میں ہوا ہے اور آخری وحی وہ ہے جو جابری امام کو ہوئی۔ اس طرح حضرت علیؓ سے شروع ہو کر نئے امام قایم تک شیعہ ائمہ کی تعداد بھی سات ہے یعنی حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، محمد الحنفیہ، علی بن حسین، محمد الباقر، جعفر الصادق اور اسمٰعیل۔ جابر کے نزدیک حضرت علیؓ کا شمار ائمہ سبعہ میں نہیں ہوتا کیونکہ وہ امام صامت ہیں یعنی ایک مخفی الوہیت جس کا رتبہ ناطق سے بلند تر ہے اور ساتوں امام دنیا میں ان ہی کی الوہیت کا مظہر ہیں۔

جابر اقانیم ثلاثہ کا قائل تھا یعنی "عین" (مراد حضرت علیؓ) "میم" (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور "سین" (حضرت سلمان فارسیؓ)۔ اس کے نزدیک "سین" کا رتبہ "میم" سے برتر ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس عہد کے دوسرے غالی شیعوں کی طرح جابر بھی تناسخ ارواح کا قائل تھا۔ اپنے ماخذ علم کے بارے میں اس کا کہنا ہے۔ یہ تمام علوم اسے امام جعفر صادق سے ملے ہیں۔ ان کے علاوہ حربی الحمیری، اُذن الحمار اور ایک راہب کو بھی اس نے اپنے اساتذہ میں شمار کیا ہے۔

یہ ہے تصوف کا اولین نقش یعنی ایک مخصوص قسم کا زہد جس پر غلو (انتہا پسندانہ شیعی عقاید) کا رنگ غالب تھا۔ یہی تصوف مختلف مراحل سے گزر کر سنی حلقوں میں پہنچا جہاں سُنی بزرگوں نے (جن پر زہد کا غلبہ تھا) نہ صرف اس کا خیر مقدم کیا بلکہ اس کے زبردست حامی اور علمبردار بن گئے یہاں تک کہ صوفیہ کے طبقے میں وہ ہستیاں بھی شامل ہوگئیں جن کی عظمت و تقدس کے چرچے رہے ہیں اور جن کو مسلمانوں کی بھاری اکثریت خراجِ عقیدت پیش کرتی رہی ہے۔

اہل تصوف کا اس حقیقت سے انکار

لیکن صوفیہ کرام اس تاریخی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ وجہ ظاہر ہے اگر تصوف کے حامی یہ بات مان لیں اور اس کا اظہار بھی کر دیں کہ سب سے پہلا صوفی ایک غالی شیعہ تھا اور تصوف دراصل ایک شیعی تحریک تھی تو سُنی حلقوں میں اس کا اعتبار ختم ہو جائے گا۔ اور سنی عوام کو صوفیہ کرام سے جو بے پناہ عقیدت ہے وہ باقی نہیں رہے گی یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات تصوف کا رشتہ جابر بن حیان اور اوائل عہد کے دوسرے شیعہ صوفیا سے جوڑنا پسند نہیں کرتے بلکہ جابر کے ایک ہم عصر و ہم وطن ابو ہاشم کوفی سے جوڑ دیتے ہیں۔

لیکن ابو ہاشم کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کچھ لوگ انھیں سنی کہتے ہیں اور کچھ شیعہ۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ یہ حلول و اتحاد کے قائل تھے اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ دہریے تھے[1]

---

[1] ملاحظہ ہو، الدکتور کامل مصطفیٰ، الصلۃ بین التصوف والتشیع (مصر ۱۹۶۹ء) ص ۲۶۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تصوّف کا سرا قرآن و سنت سے جوڑنے کی کوشش

جیسا کہ سب ہی جانتے ہیں کوئی بھی مذہبی اصول یا دینی تحریک مسلمانوں میں اس وقت تک مقبول نہیں ہو سکتی جب تک کہ انھیں یہ باور نہ کرا دیا جائے کہ اس کی اصل قرآن و سنت میں موجود ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر اہل تصوف نے تصوف کی اس ارتقائی کڑی کو، جس پر شیعیت کی چھاپ تھی، حذف کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ لفظ صوفی نہ صرف یہ کہ اسلام کے ابتدائی دور میں مستعمل تھا بلکہ اسلام سے پہلے بھی نیک لوگوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ شیخ ابونصر سراج (م ۳۸۷ھ/۹۸۸ء) فرماتے ہیں:

> "یہ لفظ (صوفی) حسن بصریؒ کے زمانے میں معروف تھا۔ چنانچہ ان سے مروی ہے کہ میں نے ایک صوفی کو طواف کرتے دیکھا... کتاب تاریخ مکہ میں محمد بن اسحاق وغیرہ سے مروی ہے کہ اسلام سے قبل ایک بار مکّہ خالی ہو گیا، اس وقت بیت اللہ کا طواف کرنے کے لیے کوئی متنفس باقی نہ رہا۔ البتہ کسی دور دراز علاقہ سے ایک صوفی مرد آتا اور طواف کر کے واپس چلا جاتا تھا۔ اگر یہ روایت پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو ثابت ہو گا کہ اسلام سے پیشتر بھی یہ لفظ مستعمل تھا اور ارباب فضل وصلاح کے لیے بولا جاتا تھا۔"

اس روایت کو نقل کر کے پروفیسر خلیق احمد نظامی نے حضرت امیر معاویہؓ سے منسوب ایک خط کا حوالہ بھی دیا ہے جس میں ایک شعر تھا جس کا ترجمہ یہ ہے:

تو مشابہ تھا ایسے صوفی سے جس کے پاس کتابیں ہوں جن میں فرائض اور آیات قرآن مذکور ہوں اور پھر اس پر یہ تبصرہ کیا ہے:

اس روایت کو اگر صحیح مان لیا جائے تو صوفی کا لفظ پہلی صدی ہجری میں استعمال ہونا ثابت ہو جاتا ہے[1]

---

[1] تاریخ مشائخ چشت، ج ۱، ص ۴۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ روایتیں ابھی تک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی ہیں۔ اور اگر انہیں صحیح مان بھی لیا جائے تو ان سے بس یہی ثابت ہوگا کہ لفظ صوفی لغوی معنی میں اسلام سے پہلے بھی استعمال ہوا ہے لیکن یہاں یہ مسئلہ زیر بحث ہے ہی نہیں اور اگر منشا یہ ہے کہ لفظ صوفی اپنے مخصوص اصطلاحی معنی میں اسلام سے پیشتر بھی رائج تھا تو اس سے تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ "تصوف" دور جاہلیت کی پیداوار ہے۔

بہرحال شیخ شہاب الدین سہروردی (م ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء) کی تحقیق یہ ہے کہ یہ نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہیں رکھا گیا[1] اور عہد صحابہ اور تابعین وغیرہم کے بارے میں امام قشیری (م ۴۶۵ھ/۱۰۷۲ء) کا بیان ہے:

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کے سوا برگزیدہ مسلمانوں کا اور کوئی لقب قرار نہیں دیا گیا کیونکہ شرفِ صحبت سے بڑھ کر اور کوئی شرف نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر جن لوگوں نے صحابہ کی صحبت پائی، ان کو تابعین کہا گیا، اس کے بعد لوگ تبع تابعین کے لقب سے پکارے گئے۔ پھر لوگوں کے مختلف درجے ہوتے گئے۔ اس لیے جن بزرگوں کی توجہ دین کی طرف زیادہ ہوئی اُن کو زاہد و عابد کے لقب سے پکارا گیا۔ لیکن جب بدعات کا ظہور ہوا اور مختلف فرقے پیدا ہو گئے تو ہر فریق نے یہ دعویٰ کیا کہ اُن میں زہاد پائے جاتے ہیں۔ اس لیے خواص اہل سنت تصوف کے نام سے ممتاز ہوئے اور دوسری صدی سے پہلے ان بزرگوں نے اس نام سے شہرت پائی۔[2]

امام صاحب کے بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تصوف دوسری ہجری کے اواخر کی پیداوار ہے یعنی وہی بات جو ہم نے دائرہ معارف اسلامیہ سے نقل کی ہے۔

بعض صوفیہ نے لفظ صوفی کو صُفّہ سے مشتق بتا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ صوفیہ اہل صفّہ کے پیرو ہیں یعنی اُن صحابۂ کرام کے جو مدینۂ منورہ میں مسجد نبوی کے قریب

---

[1] دیکھئے عوارف المعارف (اردو) لاہور ۱۹۸۲ء، ص ۱۰۵

[2] رسالۂ قشیریہ، ۹ (تاریخ مشائخ، ۴۲-۴۳- نیز عوارف المعارف، ۱۰۵-۱۰۶۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک چبوترے پر رہتے تھے، لیکن عام طور پر اس توجیہہ کو قبول نہیں کیا گیا چنانچہ جمہور صوفیہ کا کہنا ہے کہ لفظ صوفی دراصل صوف سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں پشمینہ یا اون۔ اس مفہوم کے اعتبار سے صوفی سے مراد ہے وہ شخص جو اونی لباس پہنتا ہو اور اونی لباس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ یہ ہمیشہ سے انبیاء علیہم السلام، عابد و زاہد اور نیک لوگ پہنتے رہے ہیں اور اس کی تائید میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں۔

"صوف کا لباس اختیار کرو! اپنے دلوں میں ایمان کی مٹھاس پاؤ گے۔"

اور خواجہ حسن بصری کا یہ قول مزید تائید میں نقل کیا گیا ہے:۔

"میں نے اُن ستر اصحاب کو جو بدر کی لڑائی میں شریک ہوئے تھے صوف کے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا۔"[۱]

لیکن علماء حدیث کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول و عمل سے اونی لباس کی فضیلت ثابت نہیں البتہ اس امر کی تاریخی شہادت موجود ہے کہ مسلمان "زاہدوں" نے یہ لباس عیسائی راہبوں سے لیا تھا اور مسلمان عام طور پر اسے "زی الرہبان" (راہبوں کا لباس) کہتے تھے۔ حماد بن سلمیٰ نے جب شیخ حسن بصری کے مرید فرقد السنجی کو اس لباس میں دیکھا تو کہا "دع عنك نصرانيتك هذه" اپنے بدن سے یہ نصرانیت ہٹاؤ۔ اسی طرح حضرت سفیان ثوریؒ اور عبداللہ بن مبارک نے بھی اس لباس کو ناپسند کیا تھا۔[۲]

اول تو ان کمزور روایتوں سے اونی لباس کی فضیلت ثابت نہیں ہوتی، اور اگر ہو بھی جائے تو یہ مسئلہ زیر بحث ہے ہی نہیں بلکہ اصل بات یہ تحقیق طلب ہے کہ تصوف (محض پشمینہ پوشی نہیں بلکہ تصوف کے فکری اور عملی نظام) کی اصل کتاب و سنت میں موجود ہے یا نہیں، اور یہ بات اونی لباس کی فضیلت سے ثابت نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ مؤثر اور کامیاب کوشش امام غزالی اور بعض دوسرے صوفیہ نے

۱؎ ملاحظہ ہو، عوارف المعارف، ۱۰۳، شیخ علی ہجویری، کشف المحجوب (اردو) دیوبند ۱۹۸۵ء، ۵۰۔

۲؎ دیکھئے، دائرہ معارف اسلامیہ ۶/۱۹۱، انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس ۱۰/، تصوف ۳/۱۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی ہے اور وہ اس طرح کہ تصوف سے انھوں نے مراد "تقرب الٰہی" لیا ہے اور صوفیہ سے مراد "مقربین بارگاہ الٰہی"۔ اس کی تفصیل شیخ شہاب الدین سہروردی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:۔

"یہ بات ذہن نشین رہے کہ صوفیہ کے جو عمدہ حالات ہم اس کتاب میں بیان کریں گے وہ مقربین کا حال ہوگا۔ صوفی سے مراد مقرب بارگاہ ہے کیونکہ قرآن کریم میں صوفی کا نام مذکور نہیں ہے بلکہ اس کا نام ترک کر دیا گیا ہے اور اس کا نام مقرب رکھا گیا ہے جیسا کہ ہم اس کے باب میں ذکر کریں گے۔

پورب سے پچھم تک اسلامی ممالک کے دونوں کناروں میں اہل قرب کے لیے "صوفی" کا نام معروف و مشہور نہیں ہے۔ یہ نام انھیں لوگوں کے لیے معروف ہے جو خاص قسم کا لباس استعمال کرتے ہیں۔ بلاد مغرب، بلاد ترکستان اور ماوراء النہر میں بہت سے اللہ کے مقرب بندے ہیں لیکن وہ "صوفیہ" سے موسوم نہیں ہیں کیونکہ وہ صوفیہ کا لباس استعمال نہیں کرتے اور الفاظ و اصطلاحات میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صوفیہ سے ہماری مراد مقربین ہی ہیں۔

لہٰذا وہ صوفیہ مشائخ کرام جن کے اسماء گرامی طبقات اور دیگر کتابوں میں نظر آتے ہیں وہ سب کے سب مقربین الٰہی کے مسلک پر تھے[1]

کتنی عجیب بات ہے! قرآن کریم نے جو اصطلاح استعمال کی یعنی مقرب اس کے مقابلے میں ان حضرات نے اس لفظ کو ترجیح دی جس کی اصل کے بارے میں بھی اختلاف ہے اور مفہوم کے بارے میں بھی، اور پھر کسی دلیل اور ثبوت کے بغیر "مقربین" کا اطلاق صوفیہ پر کر دیا گیا۔ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ خود قرآن کی روشنی میں "تقرب" کی وضاحت کی جاتی اور "مقربین" کی صفات بیان کی جاتیں اور پھر صوفیہ کے اوصاف بیان کیے جاتے۔ اس کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا جا سکتا تھا کہ صوفیہ کرام میں کس حد تک "مقربین" کی صفات موجود ہیں لیکن ایسا نہیں کیا گیا، اور غالباً ممکن بھی نہیں کیونکہ لفظ "تصوف" کی کوئی واضح اور جامع تعریف تو خود صوفیہ کرام بھی آج تک پیش نہیں کر سکے پھر کس بنا پر یہ دعویٰ کیا

[1] عوارف المعارف ص ۵۵؛ اسلامی تصوف ص ۲۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاسکتا ہے کہ "صوفی سے مراد مقرب بارگاہ ہے"۔ لیکن یہ دعویٰ کیا گیا اور اہل تصوف نے کسی ثبوت کے بغیر ہی اسے مان بھی لیا اور پھر تصوف کا سرا قرآن و سنت سے جوڑ دیا اور اُن تمام بزرگوں یہاں تک کہ صحابۂ کرام کو بھی صوفیہ کے طبقے میں شامل کر لیا جو کبھی بھی صوفی کے نام سے مشہور تو کیا آشنا بھی نہیں تھے۔ اس کی ایک مثال دائرہ معارف اسلامیہ سے ملاحظہ ہو جس میں تصوف پر ایک مقالہ صوفیہ کے نقطۂ نظر سے بھی شامل کیا گیا ہے اس میں تصوف کے ارتقائی داستان اس طرح بیان کی گئی ہے:

تصوف اسلامی کی تاریخ اپنے آغاز میں اس کے نام کی تاریخ سے بہت مختلف ہے ہجویری نے (کشف المحجوب: ترجمہ نکلسن، صفحہ ۴۴ میں) ابوالحسن الفوشنجی (م ۳۴۸ھ) کا قول نقل کیا ہے کہ آج کل تصوف ایک نام ہے بغیر حقیقت کے، لیکن زمانہ سابق میں یہ ایک حقیقت تھی بغیر نام کے۔ پھر ہجویری اپنی طرف سے اضافہ کرتے ہیں کہ "صحابہ کرام اور سلف صالحین کے زمانے میں یہ نام موجود نہ تھا لیکن اس کی حقیقت ہر شخص میں جلوہ گر تھی"۔ اگر "ہر شخص" کا لفظ کسی قدر مبالغہ آمیز بھی ہو، تب بھی یہ حقیقت ہے (اور سب بڑے بڑے صوفی متقدمین و متاخرین متفق ہیں) کہ اگرچہ متاخرین میں ہمیشہ بے شمار مقدس ہستیاں (مرد و زن) مختلف اقطار عالم میں موجود رہی ہیں لیکن تقدس اتنا ہمہ گیر نہ تھا جتنا اسلام کے قرن اول میں پایا جاتا تھا۔ مزید برآں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تاریخی اعتبار سے تصوف کی جڑیں رسول اللہؐ کی گوشہ گیری کے اس عمل میں پائی جاتی ہیں جو حضور اولین نزول وحی سے پہلے ماہ رمضان میں غار حرا میں فرمایا کرتے تھے۔ جنفار کا (سا) یہ عمل، جس پر آں حضرتؐ مدینے میں اپنی زندگی کے آخری سالوں میں بھی متواتر کاربند رہے اور ان کے بعض اصحاب بھی اس میں ان کی پیروی کرتے رہے، گویا ابراہیمی تصوف اور اسلامی تصوف کے درمیان ایک رشتۂ اتصال سمجھا جا سکتا ہے۔

امام غزالیؒ نے (منقذ، ص ۶۰ تا ۶۹) تصوف کو "قرب" الٰہی اور "ذوق" یعنی راست روحانی مشاہدے سے تعبیر کیا ہے....

مکی دور کے بارے میں فاضل مقالہ نگار (ابوبکر سراج الدین) فرماتے ہیں:

"مسلمانوں کا مسلک اس وقت انتہائی جدوجہد کا خالص متصوفانہ مسلک تھا..... یہ ہرگز مقام تعجب نہیں کہ بہت سے صحابۂ کرام، جنھیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

صوفیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنا روحانی رہنما تسلیم کرتے ہیں، وہی تھے جنھوں نے ابتداء میں اسلام قبول کر لیا تھا، مثلاً پہلے چار خلفاء ..... اور بہت سے دیگر صحابہ جن میں شاید سب سے زیادہ قابل ذکر سلمان فارسیؓ اور ابوذر (غفاریؓ) ہیں ..... خلفائے اربعہ کے زمانے تک تصوف، یعنی تقرب الٰہی کی شدید خواہش، اتنی عادی چیز تھی کہ مجموعی طور پر پوری امت کے اندر نفوذ کر گئی تھی .....

اگرچہ یہ اغلب نہیں کہ اس زمانے میں جماعتوں اور گروہوں کی کوئی واضح تشکیل موجود تھی تاہم دوسرے قرن کے لوگوں (تابعین) نے خود بخود ہی صحابہ (کرام) کے حلقوں میں اپنے آپ کو منسلک کر لیا تھا اور روایت کے مطابق اس قسم کے اہم ترین صوفی حلقوں میں جس کی طرف لوگ کھنچے چلے آتے تھے وہ حلقہ تھا جو (حضرت) علی (کرم اللہ وجہہ) کے گرد جمع تھا۔ یہاں یہ ذکر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ..... (حضرت) علیؓ کے انتقال فرمانے کے بعد بھی مورخین نے جس چیز کو شیعیت قرار دیا ہے وہ (ابتدائی) تصوف کے سوا کوئی اور شے نہ تھی .....

آپ نے ملاحظہ فرمایا، "تصوف" سے "تقرب" مراد لے کر تصوف کی اصل اور تاریخ کو کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا، ٹھیک اسی طرح جس طرح شیعہ علماء نے سیکڑوں سال بعد کی شیعیت کا سرا قرآن وسنت سے جوڑ دیا۔ لیکن یہ سمجھنے اور تصوف میں شیعی عناصر کی نشاندہی کرنے کے لیے ضروری ہے شیعیت کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔

شیعیت کی مختصر تاریخ

لفظ شیعہ کے لغوی معنیٰ ہیں گروہ، فرقہ، پیروکار، حامی۔ لیکن اس سے مراد ہے مسلمانوں کا وہ مذہبی فرقہ جو حضرت علیؓ کے بارے میں ایک مخصوص عقیدہ رکھتا ہے اور جس کے پانچ اساسی اصول ہیں، توحید، عدل، نبوت، امامت اور معاد۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شیعہ اور دوسرے تمام مسلمانوں (اہل سنت والجماعت) میں بنیادی فرق عقیدہ امامت ہے۔ شیعہ عقیدے کے مطابق امامت اس منصب کا نام ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں دینی و دنیوی تنظیم کا واحد مرکز ہے۔ امام کے فرائض میں اسلامی مفاد کا تحفظ شرعی احکام کا نفاذ اور مسلمانوں کی عملی تربیت داخل ہے۔ امام کا تقرر خدا کی جانب سے رسول کے ذریعہ ہوتا ہے اور اس میں جمہور کی رائے کا کوئی دخل نہیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم الٰہی حضرت علیؓ کو اپنا جانشین (امام اوّل) مقرر فرمایا اور پھر منصب امامت حضرت علیؓ ہی کی اولاد میں منتقل ہوتا رہا۔ یہ سلسلہ ۱۲ ویں امام تک جاری رہا جن کے بارے میں شیعہ عقیدہ یہ ہے کہ وہ غائب ہو گئے ہیں اور آئندہ وقت مقررہ پر بہ شکل امام مہدی ظاہر ہوں گے۔ شیعوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ان میں سے ہر امام معصوم اور تمام ظاہری و باطنی علوم کا سرچشمہ ہے۔

اس عقیدے یا شیعہ فرقے کی ابتدا کب اور کن حالات میں ہوئی اس بارے میں دو نظریے ہیں، ایک تو روایتی اور دوسرا تاریخی۔ روایتی نظریے سے مراد ہے شیعہ علماء کا نظریہ جن کا کہنا ہے کہ "شیعیت کے نشو و ارتقاء کے بنیادی عوامل وہی ہیں جو اسلام کے نشر و فروغ میں کارفرما ہے، اس لیے کہ شیعیت اسلام سے الگ کوئی دین نہیں ہے"[1]۔

اور تاریخی نظریے کا مطلب ہے شیعہ مورخین اور محققین کا نظریہ جو شیعہ علماء کے نظریے سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں لفظ شیعہ کا استعمال مذہبی معنی میں نہیں بلکہ خالص سیاسی معنی میں ہوا ہے۔ اس کا اطلاق صرف چار صحابہ، حضرت عمارؓ، مقدادؓ، ابوذر غفاریؓ اور سلمان فارسیؓ پر ہوا ہے۔ ان کو اگر شیعہ کہا جاتا ہے تو اس بنا پر کہ یہ (اور زیادہ سے زیادہ تین اور حضرات) چاہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علیؓ ہی خلیفہ بنائے جائیں چونکہ صرف خلافت کے معاملہ میں یہ حضرت علیؓ کے حامی تھے اس لیے ان کو شیعانِ علیؓ کہا جاتا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو دائرہ معارف اسلامیہ، مجتہد جعفر حسین کا مقالہ "شیعہ"۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد چند افراد کے سوا ساری امت نے حضرت ابوبکرؓ اور پھر اُن کے نامزد کردہ خلیفہ حضرت عمرؓ کی خلافت تسلیم کرلی۔ اس دوران حضرت علیؓ یا کسی اور نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات ہی میں حضرت علیؓ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا اس لیے ان ہی کو خلیفہ بنایا جانا چاہیے تھا۔

پھر جب حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کو خلیفہ بنایا گیا تو بھی تمام مسلمانوں نے ان کی خلافت تسلیم کی لیکن ان کے دورِ خلافت میں دو اہم تبدیلیاں ضرور رونما ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت علیؓ کے حامیوں (شیعانِ علیؓ) کی تعداد میں کافی اضافہ ہوگیا۔ ان میں دو مسلمان بھی شامل تھے جو حضرت علیؓ کا احترام کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ خلافت انھیں مل جائے۔ لیکن ان میں بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جنھوں نے حضرت عثمانؓ کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کیا تھا اور انھیں برطرف کرنا چاہتے تھے۔ ان سب کی حمایت بھی سیاسی نوعیت کی تھی اور ان میں سے کسی کا بھی حضرت علیؓ کے بارے میں وہ عقیدہ نہیں تھا جو موجودہ شیعوں کا ہے[1]۔

دوسری اہم تبدیلی اس دور میں یہ ہوئی کہ بعض لوگوں نے حضرت علیؓ کی (سیاسی) حمایت میں مذہبی عنصر بھی شامل کرلیا۔ اس طرح "مذہبی شیعیت" یا شیعہ مذہب کی ابتدا ہوئی۔

پہلا شیعہ عبداللہ ابن سبا اور شیعہ مذہب کا اولین خاکہ

یہ کام عبداللہ ابن سبا نے انجام دیا۔ اس کے بارے میں مشہور مورخ طبری کا بیان ہے کہ یہ دراصل یمن کا ایک یہودی تھا جو (بظاہر) حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں مسلمان ہوگیا تھا۔ اس کا مقصد مسلمانوں میں تفرقہ پھیلانا اور انھیں گمراہ کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے اسلامی مملکت میں خفیہ تنظیمیں قائم کیں۔ یہ شخص اپنے گمراہ کن عقائد کی اشاعت کچھ اس طرح کرتا تھا کہ اس کی پکڑ نہ ہو سکے۔ مثلاً مسلمانوں سے خطاب

---

[1] تفصیلی جائزے کے لیے دیکھئے، ڈاکٹر مومن، شیعی اسلام، ۲۰، ۶۲، ۶۳۔
(Dr. Moojan Momen: An Introduction to Shii Islam, Delhi, 1985)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر کے کہتا کہ یہ عجیب بات ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ واپس آئیں گے اور اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم واپس آئیں گے تو لوگ اس بات کو جھوٹ سمجھتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے حق میں فرمایا ہے:

جس نے حکم بھیجا تجھ پر قرآن کا وہ پھیر لانے والا ہے تجھ کو پہلی جگہ۔ (۲۸/۸۰)

اس لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عیسیٰؑ کے بہ نسبت لوٹنے کے زیادہ مستحق ہیں۔ چنانچہ بعض لوگوں نے اس کی بات مان لی اور لوگ اس موضوع پر بحث کرنے لگے۔

ایک اور بات وہ لوگوں سے یہ کہتا کہ گذشتہ زمانے میں ہر پیغمبر کا ایک وصی ہوتا تھا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی حضرت علیؓ ہیں۔ جس طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اسی طرح حضرت علیؓ خاتم الاوصیاء ہیں۔ اس (تمہید) کے بعد لوگوں سے کہتا کہ اس سے زیادہ ظالم کون ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت پر عمل نہیں کیا اور آپ کے وصی کا حق غصب کر کے امت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اس طرح وہ لوگوں کو حضرت عثمانؓ کے خلاف بھڑکا کر بغاوت پر آمادہ کرتا تھا[۱]۔ اس نے حضرت علیؓ کی حمایت میں اتنا غلو کیا کہ انھیں خدا کہنے لگا۔ اسی بناء پر کہا جاتا ہے کہ حضرت علیؓ نے اس کے بعض متبعین کو جلوا دیا تھا۔ پھر جب ۴۰ھ/۶۶۱ء میں ایک خارجی عبدالرحمٰن ابن ملجم نے حضرت علیؓ کو کوفے میں شہید کر دیا تو ابن سبا نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ حضرت علیؓ کی وفات نہیں ہوئی بلکہ وہ بادلوں میں زندہ ہیں اور ایک دن ضرور واپس آئیں گے اور دنیا کو انصاف سے بھر دیں گے۔

ابن سبا کے یہ عقاید و نظریات ظاہر ہے قرآن و حدیث کے بالکل خلاف تھے، اس کے علاوہ اس پر مسلمانوں میں گمراہی اور فساد پھیلانے کا الزام بھی تھا اس لیے عام طور پر مسلمانوں نے اس کی دعوت کو قبول نہیں کیا اور حضرت علیؓ کے حامیوں نے بھی اس کی تائید نہیں کی۔

ان تصریحات اور دوسری تمام تاریخی شہادتوں سے یہ امر بالکل واضح ہے

---

[۱] دیکھئے طبری (اردو، دیوبند) ج ۳، ص ۴۰۸-۴۰۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ حضرت علیؓ کے حامیوں میں کوئی بھی ابن سبا کی طرح ان کی الوہیت کا قائل تھا اور نہ کسی کے ذہن میں امامت کا وہ تصور تھا جو آج شیعہ مذہب کا اساسی اصول ہے اس لیے ان میں سے کسی کو بھی مذہبی معنی میں شیعہ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ انھیں سیاسی معنی میں شیعہ ضرور کہا جا سکتا ہے اور مورخین نے یہ لفظ اسی معنی میں استعمال بھی کیا ہے لیکن بعد میں اس کا اطلاق اُن لوگوں پر بھی ہونے لگا جنھیں اب "غلات" یا غالی شیعہ کہا جاتا ہے۔ اس کا پس منظر اور تفصیل یہ ہے:

شیعت "غلو" سے "اعتدال" تک

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کی ایک جماعت نے حضرت حسنؓ کو خلیفہ بنا لیا لیکن یہ چند ماہ بعد ہی حضرت امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ اس طرح خلافت حضرت امیر معاویہؓ کے خاندان (بنو امیہ) میں منتقل ہو گئی حضرت امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین مقرر کر دیا اور پھر حضرت حسینؓ کا حکومت وقت سے تصادم ہوا اور کربلا کا واقعہ پیش آ گیا لیکن اس کے بعد بھی حضرت علیؓ کی اولاد میں سے بعض افراد یا اُن کے نام سے کچھ دوسرے لوگ خلفائے بنو امیہ کے خلاف خروج کرتے رہے۔ ان لوگوں نے کربلا کے المیے اور بعض اموی حکام کی ظالمانہ روش سے فائدہ اٹھا کر بنو امیہ کا تختہ پلٹنے کی متعدد ناکام کوششیں کیں۔ یہ سب لوگ بھی شیعہ ہی کے نام سے مشہور رہیں۔ ان تمام شیعوں کے بارے میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان کے عقائد و نظریات دوسرے تمام مسلمانوں سے بالکل مختلف تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ خلافت یا امامت کا حق صرف حضرت علیؓ کو تھا اور ان کے بعد یہ حق اُن کی اولاد میں منتقل ہوتا رہا۔ چنانچہ ایک شخص مختار الثقفی نے دعویٰ کیا کہ محمد الحنفیہ (جو حضرت فاطمہؓ سے نہیں بلکہ حنیفہ نامی قبیلے کی ایک خاتون سے حضرت علیؓ کے بیٹے تھے) امام مہدی ہیں۔ بہت سے لوگ مختار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ساتھ ہو گئے لیکن اموی لشکر نے اسے شکست دی اور وہ مارا گیا۔ ۸۱ھ/۷۰۰ء میں محمد الحنفیہ کا بھی انتقال ہو گیا لیکن کچھ لوگوں نے ان کی وفات کا انکار کر دیا اور کہا کہ وہ زندہ ہیں اور آیندہ واپس آئیں گے۔ البتہ جن لوگوں نے اُن کی وفات تسلیم کر لی انھوں نے ان کے بیٹے ابو ہاشم کو اپنا امام بنا لیا۔ تقریباً ہر امام کی موت پر یہی ہوتا رہا، اور اس طرح شیعہ مختلف فرقوں میں بٹتے رہے، کوئی حضرت علیؓ کی اولاد میں سے کسی نہ کسی کو امام مانتا اور پھر اس کی وفات پر اختلاف ہو جاتا، اور ایک نیا شیعہ فرقہ جنم لے لیتا تھا۔

اسلامی تاریخ کی ابتدائی صدیوں میں ایسے بہت سے شیعہ فرقے رونما ہوئے ہیں مثلاً سبائیہ، اسحٰقیہ، میمیہ، علی الٰہیہ، ہاشمیہ، عباسیہ، مسلمیہ، بیانیہ، زیدیہ، منصوریہ، خطابیہ، غرابیہ، جعفریہ، سبعیہ (اسمٰعیلیہ) قرامطہ، نصیریہ، اور امامیہ (اثناعشریہ)۔[1]

ان سب کے عقائد کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے ان میں سے بیشتر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت علیؓ یا دونوں کی الوہیت کے قائل تھے اور کسی نہ کسی امام کو خدا کا اوتار مانتے تھے۔ بعض تجسیم (یعنی خدا کے لیے جسم) کے اور بعض حلول اور تناسخ ارواح کے قائل تھے۔ اس پر سب کا اتفاق تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ ہی کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا اور وہی امامت کے مستحق تھے۔ لہٰذا جن لوگوں نے انھیں یا ان کی اولاد کو اس حق سے محروم کر کے خود خلافت پر قبضہ کر لیا (یعنی خلفائے ثلٰثہ، بنو امیہ اور بنو عباس) وہ سب غاصب تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ حضرت علیؓ کے مخالفین (مراد ہے حضرت ابو بکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ) نے قرآن میں تحریف کی اور ان آیتوں کو حذف کر دیا جو حضرت علیؓ کی امامت سے متعلق تھیں۔ یہ لوگ قرآن کے باطنی معنی پر بہت زور دیتے تھے اور قرآنی آیات کی اس طرح تاویل کرتے تھے کہ ان کے عقائد کی تائید ہو سکے۔ بعض فرقے نماز اور روزے کے علاوہ بقیہ ارکان اسلام کے منکر تھے اور بعض یہ کہتے کہ حقیقت کا ادراک ہو جانے کے بعد شرعی احکام ساقط ہو جاتے ہیں۔

---

[1] ان فرقوں کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو شیعی اسلام، ۴۰-۶۰، نیز انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شیعہ مورخین کی تحقیق یہ ہے کہ کم از کم چوتھی صدی ہجری/۱۰ ویں صدی عیسوی کے نصف تک تمام شیعوں کے اسی قسم کے عقائد تھے۔ بتدریج ان کے عقائد میں تبدیلی ہوتی رہی۔ کچھ تو عام سیاسی حالات اور کچھ معتزلہ سے متاثر ہو کر شیعہ علماء نے ۵ ویں صدی ہجری/۱۱ ویں صدی عیسوی تک شیعہ مذہب کو وہ شکل دے دی جو آج ہمارے سامنے ہے۔ اس شیعیت اور ابتدائی دور کی شیعیت میں بہت فرق ہے۔ موجودہ شیعہ بہت سی اُن باتوں کو مثلاً حلول، ائمہ کی الوہیت، تناسخ ارواح وغیرہ کو نہیں مانتے جن کو اوائل عہد کے شیعہ مانتے تھے۔ چونکہ ابتدائی دور کے شیعوں کے بعض عقائد موجودہ شیعیت سے ہم آہنگ نہیں ہوتے اس لیے اُن شیعوں کو عقائد میں انتہا پسند یا غالی شیعہ کہا جاتا ہے۔

اس مختصر جائزے سے جو چند باتیں واضح ہوتی ہیں اور خاص طور پر قابل توجہ ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں شیعہ مذہب کا کوئی سراغ نہیں ملتا اور یہ کہ لفظ شیعہ کا اطلاق ابتداء میں خالص سیاسی معنیٰ میں اُن لوگوں پر ہوا ہے جو خلافت کے معاملے میں حضرت علیؓ کے حامی تھے بالخصوص ان لوگوں پر جنھوں نے حضرت امیر معاویہؓ کے مقابلے میں حضرت علیؓ کا ساتھ دیا اور ان کے ساتھ جنگ جمل اور جنگ صفین وغیرہ میں لڑے۔ عقائد کے اعتبار سے شیعانِ علیؓ اور شیعانِ معاویہؓ کے درمیان کوئی فرق نہیں تھا لہٰذا ان میں سے کوئی بھی اس معنیٰ میں شیعہ نہیں تھا جس معنیٰ میں یہ لفظ آج استعمال ہوتا ہے۔

(۲) تاریخی اعتبار سے شیعہ مذہب کا بانی عبداللہ ابن سبا تھا لیکن وہ عقائد میں انتہا پسند یعنی غالی شیعہ تھا۔ اس کے متبعین اور چوتھی صدی ہجری کے نصف تک تمام شیعہ عقاید کے اعتبار سے غالی تھے یعنی امام کی الوہیت، حلول اور تناسخ ارواح جیسے امور کے قائل تھے اور اس امر کی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں کہ ان غالی شیعوں کے علاوہ دوسری قسم کے یعنی اعتدال پسند شیعہ اس دور میں موجود رہے ہوں اور یہ کہ

(۳) موجودہ شیعہ مذہب کی تشکیل اور اس کے اصولوں کی تدوین ۵ ویں صدی ہجری/۱۱ ویں صدی عیسوی میں ہوئی ہے[1] اس سے ظاہر ہے کہ تصوف کی طرح شیعہ

[1] ان تمام پہلوؤں پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھئے شیعی اسلام، باب ۴۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذہب بھی بہت بعد کی پیداوار ہے لیکن صوفیہ کی طرح شیعہ علماء بھی اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔

شیعہ علماء اور صوفیہ کے نقطۂ نظر میں مشابہت

جس طرح صوفیہ کرام جابر بن حیّان کو سب سے پہلا صوفی تسلیم نہیں کرتے ٹھیک اسی طرح شیعہ علماء بھی عبداللہ ابن سبا کو پہلا شیعہ اور شیعہ مذہب کا بانی نہیں مانتے چنانچہ مجتہد جعفر حسین رقمطراز ہیں:

"تشیع کے سلسلے میں عبداللہ ابن سبا کا نام بھی لیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس نے اسلام کی نقاب اوڑھ کر مصر، حجاز، شام اور عراق میں گھوم پھر کر مسلمانوں کو مسلمانوں کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ شیعہ اس انتساب کو غلط سمجھتے ہیں[1]"

بلکہ توہین سمجھتے ہیں[2]۔ وجہ ظاہر ہے۔ دونوں غالی شیعہ تھے۔

آپ نے یہ بھی ملاحظہ فرمایا کہ تصوف اور شیعیت دونوں کے نشو و ارتقاء میں غالی شیعوں کا اہم رول رہا ہے اور یہ بات تصوف اور شیعیت کے حق میں نہیں جاتی اس لیے اہل تصوف اور شیعہ علماء دونوں نے ان تحریکوں کی اُن ارتقائی کڑیوں کو حذف کر کے ان کا رشتہ قرآن و سنت سے جوڑنے کی کوشش کی ہے لیکن اس معاملے میں دونوں ہی کو "تاویل" کا سہارا لینا پڑا ہے۔ صوفیہ نے تو "صوفی" سے مراد "مقرب بارگاہ" لے کر تصوف کا رشتہ قرآن سے جوڑ دیا اور شیعہ علماء نے "شیعیت" سے مراد "اہل بیت سے عقیدت" لے کر اس آیت سے استدلال کیا ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ	اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ تم اہل بیت
عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ	نبی سے گندگی کو دور کرے اور تمہیں پوری
وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝	طرح پاک کر دے۔ (۳۳:۳۳)

اگرچہ آیت کے سیاق و سباق سے بالکل واضح ہے کہ یہاں خطاب صرف

---

[1] دائرہ معارف اسلامیہ (شیعہ، ۹۰۷) [2] شیعی اسلام، ۴۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ازواج مطہرات سے ہے لیکن شیعہ علماء نے اہل بیت کا مصداق صرف حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو ٹھیرایا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس آیت کی رو سے یہ چاروں ہستیاں پاک کر دی گئیں اور پھر تطہیر کا دائرہ اور زیادہ وسیع کر کے ان کی اولاد میں سے اُن کو بھی شامل کر لیا گیا جن کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ امام تھے اور پھر ان کو معصوم مان لیا گیا[1] اور اس طرح قرآن سے شیعیت کا رشتہ قائم کر دیا گیا۔

آپ نے دیکھا تصوف اور شیعیت کی اصل اور تاریخ، نیز صوفیہ اور شیعہ نقطۂ نظر میں کتنی مشابہت ہے۔ یہ مشابہت محض اتفاقی نہیں بلکہ ان دونوں کے باہمی گہرے تعلق کی بناء پر ہے۔ چنانچہ تصوف کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس پر شیعیت کی گہری چھاپ نہ ہو۔

تصوف اور شیعیت، دونوں میں حضرت علیؓ کی مرکزی حیثیت

شیعوں کی طرح صوفیہ بھی حضرت علیؓ ہی کو اپنا پیشوا اور امام مانتے ہیں۔ شیخ علی ہجویری نے حضرت جنید بغدادی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"ہمارے شیخ اصول اور مصیبتوں میں علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔"

اور پھر اس کی وضاحت اس طرح کی ہے:

"یعنی ہمارے امام معاملات اور طریقت کے علم میں علیؓ مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ ہیں[2]۔"

اور شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک حضرت علیؓ اس امت کے پہلے مجذوب اور پہلے صوفی و عارف ہیں[3]۔ چنانچہ صوفیہ کرام کے تمام سلسلے (سوائے نقشبندی سلسلے کے جو حضرت ابوبکرؓ سے منسوب ہے) حضرت علیؓ ہی کی ذات پر منتہی ہوتے ہیں۔

شیعہ مذہب میں اگر حضرت علیؓ کی مرکزی حیثیت ہے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ شیعیت منسوب ہی حضرت علیؓ سے ہے لیکن صوفیہ کرام کی بھاری اکثریت کا تعلق

---

[1] دیکھئے، دائرہ معارف اسلامیہ ("شیعہ" ۸۹۸): رضوی، اثنا عشری، ۸۰

[2] کشف المحجوب، ۸۴ [3] فیوض الحرمین ۵۱ (تصوف، ۱۵۵)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو سنی مسلک سے رہا ہے پھر انھوں نے تمام صحابہ کرامؓ میں سے حضرت علیؓ ہی کا انتخاب کیوں کیا۔ بظاہر اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی، کیونکہ صوفیہ کرام کے عقائد و نظریات اور حضرت علیؓ کی سیرت میں کوئی مناسبت نظر نہیں آتی۔ بہرحال صوفیہ نے اس ترجیح کی وجہ یہ بتائی ہے کہ حضرت علیؓ کو ایک مخصوص علم عطا کیا گیا تھا اور وہی علم دراصل تصوف کا سرچشمہ ہے۔ چنانچہ شیخ ابو نصر سراج طوسی حضرت علیؓ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ وہی ذات گرامی ہے جنھیں علم لدنی عطا فرمایا گیا اور علم لدنی وہ علم ہے جو خاص طور پر حضرت خضر کو دیا گیا تھا۔ اس کی تائید میں انھوں نے حضرت علیؓ سے منسوب یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ :-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ستر قسم کے علوم سکھائے جنھیں میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا"[1]

اس کی حسی شکل یہ بیان کی گئی ہے :

"رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی رات فقر کا خرقہ عطا ہوا تھا۔ آپ نے صحابہ کو بلا کر فرمایا: مجھے ایک خرقہ ملا ہے، یہ ایسے شخص کو دیا جائے گا جو میرے سوال کا صحیح جواب دے گا۔ پھر ابو بکرؓ کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا کہ اگر یہ خرقہ تمہیں ملے تو کیا کرو گے؟ عرض کی: صدق اختیار کروں گا اور طاعت اور عطا کروں گا۔ پھر عمرؓ سے پوچھا، تو عرض کی: میں عدل و انصاف کروں گا۔ پھر عثمانؓ سے پوچھا۔ عرض کی: انفاق (عطا و کرم) اختیار کروں گا اور سخاوت کروں گا۔ پھر علیؓ سے پوچھا۔ عرض کی: میں پردہ پوشی کروں گا اور بندگانِ خدا کے عیب چھپاؤں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ خرقہ لے لو۔ مجھے یہی حکم تھا کہ جو صحابی یہ جواب دے اسے دے دیا جائے"[2]

---

[1] دیکھئے کتاب اللمع، ۱۲۹، ۳۷۸ (لیکن حضرت علیؓ نے فہم قرآن کے علاوہ اپنے حق میں کسی اور علم سے انکار کیا ہے۔ جیسا کہ بخاری (ج ۴، صفحہ) کی روایت سے ظاہر ہے۔ تصوف، ۱۵۴، حاشیہ زیریں۔

[2] پروفیسر خلیق احمد نظامی (تاریخ مشائخ، ۳۲۴) نے یہ روایت بغیر کسی تبصرے کے فوائد الفواد کے حوالے سے نقل کر دی ہے لیکن محدثین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ حضرت علیؓ کو اور اُن کے ہاتھوں حضرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اوّل تو علماء کے نزدیک یہ روایتیں ہی قابل اعتبار نہیں اور اگر انھیں صحیح مان بھی لیا جائے تو بھی ان کی بنیاد پر حضرت علیؓ کا تصوف سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔

اب ذرا اس پر غور فرمائیے۔ روایت کی رو سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف حضرت علیؓ کو ستر قسم کے علوم سکھائے اور اس خصوصیت میں کوئی اور صحابی شریک نہیں تھا۔ تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو یہ علوم اس لیے سکھائے تھے کہ ان سے صرف حضرت علیؓ ہی فائدہ اٹھائیں اور اس بیش بہا خزانے کو اپنے ساتھ اس دنیا سے لے جائیں۔ اگر آپ کا منشا یہی تھا اور ایسا ہی ہوا بھی تو ظاہر ہے کہ صوفیۂ کرام کو بھی اس علم سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ اس صورت میں حضرت علیؓ اور ان کے مخصوص علوم یا "علم لدنی" کا تصوف سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔ یہ بھی ظاہر ہے انھوں نے ان علوم کی عام اشاعت نہیں کی۔ اب ایک ہی صورت باقی رہ جاتی ہے، وہ یہ کہ حضرت علیؓ نے ایک یا چند مخصوص اشخاص کو رازدارانہ طور پر یہ علوم سکھا دیے ہوں، اس امر کی اگرچہ کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں تاہم صوفیہ کا دعویٰ ہے کہ حضرت حسن بصری، حضرت علیؓ کے مرید اور خلیفہ تھے اور ان ہی کے ذریعہ روحانی فیض کا سلسلہ جاری ہوا۔ لیکن خواجہ حسن بصری کے ذریعہ حضرت علیؓ سے تصوف کا سلسلہ خواجہ صاحب کی وفات کے بھی تقریباً پانچ سو سال بعد قائم کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس سلسلے کی قدیم ترین اسناد جو خلدی (م ۳۴۸ھ ۹۵۹ء) نے دی ہے، اس طرح ہے:

(۷) جنید (۶) سقطی (۵) معروف کرخی (۴) فرقد (۳) حسن بصری (۲) حضرت انس بن مالک۔

اس اسناد میں حضرت علیؓ کا کہیں ذکر ہی نہیں اور شیخ ابو علی دقاق (م ۴۰۵ھ/۱۰۱۴ء) کی اسناد میں بھی حضرت علیؓ کا نام شامل نہیں ہے۔ البتہ چودہویں صدی میں جو اسناد مشہور ہوئیں اس میں خواجہ حسن بصری سے پہلے حضرت علیؓ کا نام شامل ہو گیا ہے[1] لیکن علامہ

---

[2] حسن بصری کو خرقہ دیے جانے کی روایت کو باطل، جھوٹ اور افترا پردازی کہا ہے۔ موضوعات کبیر ۶۴ (تصوف، ۱۶۲)

[1] جو اس طرح ہے: جرجانی، مغربی، ابو علی کاتب یا زجاجی، رودباری، جنید بغدادی، سقطی، معروف کرخی داؤد طائی، حبیب عجمی، حسن بصری اور حضرت علیؓ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابن جوزی اور ذہبی نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس اسناد میں قدیم ترین چار واسطے یعنی حضرت علیؓ، حسن بصری، حبیب عجمی، داؤد طائی منحول ہیں کیونکہ یہ بزرگ کبھی آپس میں ملے ہی نہیں تھے[1]

شاہ ولی اللہ صاحب بھی اسی کے قائل ہیں کہ خواجہ حسن بصری حضرت علیؓ کے خلیفہ نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ اُس وقت خورد سال تھے[2] ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

صوفیہ صافیہ جو اوّل زمانے میں ہوئے ہیں تو ان کا ارتباط محبت اور تعلیم اور نفس کی تہذیب کے آداب سے مودب ہونے سے تھا۔ اس وقت خرقہ اور بیعت نہ تھی[3]

دراصل صوفیہ نے مآخذ کے معاملے میں عام طور پر احتیاط سے کام نہیں لیا ہے۔ مثال کے طور پر خواجہ حسن بصری ہی کے معاملے کو لے لیجئے۔ مورخین نے ان کی تاریخ پیدائش ۲۱ھ/۶۴۲ء بتائی ہے یعنی حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں پیدا ہوئے تھے۔ جیسا کہ خواجہ فریدالدین عطار کے بیان سے ظاہر ہے لکھتے ہیں:

"ولادت کے بعد جب آپ کو حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس کا نام حسن رکھو کیونکہ یہ بہت ہی خوبرو ہے۔"

لیکن نہ جانے کس طرح خواجہ عطار نے خواجہ بصری ہی کے بارے میں یہ کہاں سے لکھ دیا:

"آپ کی والدہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کی کنیز تھیں اور جب بچپن میں آپ کی والدہ کسی کام میں مصروف ہوتیں اور آپ رونے لگتے تو ام المومنین آپ کو گود میں اٹھا کر اپنی چھاتیاں آپ کے منہ میں دے دیتیں اور وفورِ شوق میں آپ کے پستان سے دودھ بھی نکلنے

---

[1] دیکھئے، دائرہ معارف اسلامیہ (تصوف، ۲۵۰، ۲۶۶م) [2] تاریخ مشائخ چشت ۱۹۰

[3] الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ، ۲۰۳۔ پروفیسر نظامی نے بھی اس معاملہ میں "محتاط" تبصرہ ان الفاظ میں کیا ہے: تصوف کے ابتدائی دور کی بعض ممتاز اور مرکزی شخصیتوں سے سلسلہ کا رشتہ بعد کو جوڑا گیا تھا فکری اعتبار سے بعض بعد کے مشائخ کا ان مرکزی شخصیتوں سے متاثر یا منسلک ہونا تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن تنظیمی حیثیت سے ان کا تعلق ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ مشائخ، ۱۶۱۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لگتا۔ اندازہ فرمائیے کہ جس نے ام المومنین کا دودھ پیا ہو اس کے مراتب کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔"

اتنا ہی نہیں، آگے تحریر فرماتے ہیں:

بچپن میں آپ نے ایک دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیالے کا پانی پی لیا اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ میرے پیالے کا پانی کس نے پیا ہے تو حضرت ام سلمہؓ نے کہا کہ حسن نے۔ یہ سُن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نے جس قدر پانی میرے پیالے میں سے پیا ہے اسی قدر میرا علم اس میں اثر کر گیا۔

ایک دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ام سلمہؓ کے مکان پر تشریف لائے تو انھوں نے حسن بصری کو آپ کی آغوش مبارک میں ڈال دیا۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے لیے بھلائی کی دعا فرمائی اور اس دعا کی برکت سے آپ کو بے پناہ مراتب حاصل ہوئے۔

اور ان کی بیعت کے بارے میں لکھتے ہیں:

آپ کو حضرت حسن بن علیؓ سے شرف بیعت حاصل تھا اور انھیں سے تعلیم بھی پائی۔ لیکن "تحفہ" کے مصنف لکھتے ہیں کہ آپ حضرت علیؓ سے بیعت تھے اور انھیں کے خلفاء میں سے ہوئے۔[1]

ظاہر ہے حضرت حسن بصری سے عقیدت رکھنے والے ان تمام باتوں کو صحیح سمجھیں گے بالخصوص "تحفہ" کے مصنف کے بیان کو تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ حضرت علیؓ کا مخصوص علم خواجہ بصری اور اُن سے مشائخ صوفیہ کو ملا ہے۔

حضرت علیؓ کے بارے میں شیعوں کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاص علم رازدارانہ طور پر حضرت علیؓ کو منتقل کر دیا تھا اور پھر یہی علم حضرت علیؓ کی اولاد میں سے ائمہ کو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا۔[2] اب یہ فیصلہ اہل تصوف اور

---

[1] تذکرۃ الاولیا، (اردو۔ دہلی) ص۱۲ [2] شیعی اسلام، ۱۵۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شیعہ علماء کو کرنا ہے کہ حضرت علیؓ کا یہ مخصوص علم حضرت حسن بصری کے ذریعہ مشائخ صوفیہ کو ملایا شیعہ ائمہ کو۔

اس ضمن میں ایک بہت ہی اہم بات جو قابل توجہ اور تحقیق طلب ہے وہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث کی موجودگی میں اس "مخصوص" یا "باطنی" علم کی شیعہ اور صوفیہ کو آخر ضرورت ہی کیوں پیش آئی۔ آئیے اس معاملے میں پہلے شیعہ موقف کا جائزہ لیتے ہیں۔

شیعہ علماء کی دینی سرمائے سے بیزاری اور "علم باطن" سے دل چسپی

جیسا کہ سب ہی جانتے ہیں اسلام کا سارا علمی سرمایہ صحابہ کرامؓ ہی کے ذریعہ اس امت کو ملا ہے۔ یہی وہ جماعت ہے جس نے قرآن کریم بلاواسطہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، سمجھا اور محفوظ کیا، اسلام کا بہترین عملی نمونہ اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں دیکھا، اور اپنی زندگیوں کو اسی سانچے میں ڈھالا اور پھر پوری احتیاط کے ساتھ یہ سارا علم تابعین کے اور انھوں نے تبع تابعین کے حوالے کر دیا۔ یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ محدثین نے اس علم کو کتابی شکل دے دی۔ اسی سرمائے کی بنیاد پر قرآن کی تفسیریں اور سیرت وتاریخ کی کتابیں لکھی گئیں اور فقہ کی تدوین ہوئی۔ ظاہر ہے کتاب وسنت کے اس علم کے بغیر اسلام کو سمجھا جا سکتا ہے نہ اس پر عمل ممکن ہے۔

لیکن شیعوں نے اس علمی سرمائے کو ناقابل اعتبار ٹھیرا کر رد کر دیا، ان کا کہنا تھا کہ یہ تمام علم اُن صحابہ کے ذریعہ آیا ہے جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حضرت علیؓ کو اُن کے حقِ خلافت (امامت) سے محروم رکھا اور خود اس پر قبضہ کر لیا اور دوسرے تمام لوگوں نے اس میں ان کا ساتھ دیا اور اس طرح یہ سب راہِ حق سے بھٹک گئے لہٰذا روایت حدیث میں ان کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا[1] رہی اللہ کی کتاب تو وہ بھی مشتبہ ہو گئی کیونکہ حضرت علیؓ کے مخالفین

---

[1] دیکھئے شیعی اسلام ص ۱۷۳ جہاں اصل الفاظ یہ ہیں:۔

In Shii Islam, howere, the majority of the companions, in accepting the Caliphate of Abu Bake, Umar and Uthman in prefrence to Ali, are considered to have erred, and therefore can not be regarded as reliable transmitters of tradition.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے وہ آیتیں حذف کر دیں جو حضرت علیؓ کی امامت سے متعلق تھیں۔

شیعوں نے خلفائے ثلثہ (حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، اور عثمانؓ) اور دوسرے صحابۂ کرام پر یہ الزامات ہی نہیں لگائے بلکہ ان میں انتہائی غالی فرقے پیدا ہوئے جنھیں کسی بھی پہلو سے مسلمان نہیں کہا جا سکتا تھا[1] ان کو اگر "مسلمان" یا شیعہ کہا گیا ہے تو محض اس لیے کہ یہ حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کے نام سے (درحقیقت "حب علیؓ" میں نہیں بلکہ "بغض معاویہؓ" میں) بنو امیہ کا تختہ پلٹ کر خود اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اس کے علاوہ اپنے انتہا پسندانہ عقائد "غلو" کی وجہ سے خود کو اسلام کے دائرے میں باقی رکھنا مشکل ہو گیا اس لیے بالآخر بیشتر شیعوں کو یہ مان لینا پڑا کہ قرآن کریم میں کوئی تحریف یا کمی بیشی نہیں ہوئی ہے اور یہ اسی شکل میں پوری صحت کے ساتھ ہم تک آگیا ہے جس شکل میں نازل ہوا تھا۔

اس طرح انھیں اسلام کا ایک ماخذ تو مل گیا لیکن محض متن قرآن کی بنیاد پر شیعہ مذہب کی تشکیل اور اس کے اصولوں کی تدوین نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی تفسیر و تشریح نیز عملی شکل کے لیے انھیں پھر حدیثوں اور صحابہ کے عمل کی طرف رجوع کرنا پڑتا اور ایسا کرنے کے لیے یہ تیار نہیں تھے۔ لیکن اس کمی کو انھوں نے دوسرے طریقوں سے پورا کر لیا۔

ایک طریقہ تو یہ اختیار کیا کہ قرآن کی آیتوں کی اس طرح تاویل کی یعنی اپنی طرف سے ایسے معنی بیان کیے کہ ان کے عقائد کی تائید ہو سکے۔ اس قسم کی "تفسیر" کو یہ "باطنی تفسیر" کہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر مقدس متن کے کچھ باطنی معنی بھی ہوتے ہیں جو ظاہری معنی سے کسی طرح کم اہم نہیں ہوتے۔

اس نظریے کے مطابق ہر نبی کا منصب یہ ہے کہ وہ متن مقدس کے ظاہری معنی بیان کر دے اور ظاہری اعمال سے متعلق احکامات عام بندوں تک پہنچا دے۔ بہ حیثیت امام

---

[1] مثلاً ایک شیعہ فرقہ (علیانیہ) حضرت علیؓ کی الوہیت کا قائل تھا اور کہتا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کے رسول تھے لیکن آپ نے حضرت علیؓ کی طرف دعوت دینے کی بجائے اپنی طرف دعوت دی۔ ان ہی میں سے بعض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ دونوں کو خدا مانتے تھے۔
ایک اور فرقہ معمریہ ایک شخص ابو الخطاب کی نبوت کا قائل تھا۔ اسی طرح بہت سے دوسرے شیعہ مختلف اشخاص کو رسول مانتے تھے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے شیعی اسلام ۴۶ – ۶۰ جہاں ان فرقوں کے عقائد بیان کیے گئے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کا منصب یہ ہے کہ متن کے باطنی معنیٰ اور مخفی حقائق کچھ مخصوص لوگوں کے سامنے بیان کرے۔ ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے جو منصب امامت میں اس کا جانشین ہوتا ہے اور اس حیثیت سے ہر امام باطنی علم اپنے جانشین کو خفیہ طور پر منتقل کر دیتا ہے۔ اس علم کی روشنی میں قرآنی آیات کے جو معنیٰ بیان کیے گئے ہیں ان سے علم باطن کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

قرآن میں ارشاد ہے: "اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر وہ جو ظالم ہیں (۲۹/۴۹)"۔ شیعوں کے نزدیک یہاں "آیات" سے مراد "ائمہ اہل بیت" ہیں۔ بلکہ قرآن میں جہاں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے "ائمہ" ہی مراد ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سے الفاظ مثلاً "صراط مستقیم" "السبیل" "نعمت" "عروۃ الوثقیٰ (مضبوط حلقہ) حبل اللہ (اللہ کی رسی) سے ائمہ اہلِ بیت ہی مراد ہیں۔

قرآن میں ایک اور جگہ ارشاد ہے:

> ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے، مگر انسان نے اسے اٹھالیا۔ بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔" (۳۳/۷۲)

یہاں "امانت" سے مراد حضرت علیؓ کی "امامت" ہے اور ظالم و جاہل سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس منصب پر قبضہ کیا۔

ایک اور آیت کے باطنی معنیٰ:

> سورج اور اس کی دھوپ کی قسم، اور چاند کی قسم جب کہ وہ اس کے پیچھے آتا ہے، اور دن کی قسم جب کہ وہ (سورج کو) نمایاں کر دیتا ہے، اور رات کی قسم جب کہ وہ (سورج کو) ڈھانک لیتی ہے (الشمس)

یہاں (بقول شیعہ علما) سورج سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور چاند سے مراد حضرت علیؓ ہیں۔ دن سے مراد ہے امام اور رات سے مراد ہیں دشمنان ائمہ بالخصوص حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جن کی خلافت نے حضرت علیؓ کو ڈھانک لیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پورے قرآن کی تفسیر اسی طرح کی گئی ہے۔ اس پر دوسرے لوگ چاہے اعتراض کریں صوفیہ کرام نہیں کر سکتے کیونکہ اگر "مقربین" سے وہ "صوفیہ" مراد لے سکتے ہیں تو شیعہ "آیات" سے "ائمہ" مراد کیوں نہیں لے سکتے؟

رہا یہ مسئلہ کہ اس قسم کی تاویل یا تفسیر کی سند یا اس کی صحت کی دلیل کیا ہے تو اس بارے میں امام جعفر صادق سے منسوب یہ قول نقل کیا جاتا ہے:

> "اللہ کا علم دو طرح کا ہے۔ ایک تو وہ جو اس نے فرشتوں، انبیاء اور رسولوں پر ظاہر فرمایا ہے۔ اس طرح جو کچھ ان پر ظاہر فرمایا گیا ہے وہ ہم بھی جانتے ہیں۔ دوسرا وہ علم ہے جو اسی کی ذات سے مخصوص ہے (کسی پر ظاہر نہیں ہوا)۔ وہ جب اس خاص علم کے کسی حصے سے پردہ اٹھاتا ہے تو وہ ہم پر بھی منکشف ہو جاتا ہے اور ہم سے پہلے بھی ائمہ کے ساتھ یہی معاملہ رہا ہے[1]"

شیعہ علماء کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ رسول کی طرح امام پر بھی وحی نازل ہوتی ہے یا الہام ہوتا ہے دونوں میں فرق بقول امام جعفر صادق یہ ہے کہ رسول وحی لانے والے فرشتے کو دیکھتا ہے اور اس سے ہم کلام بھی ہوتا ہے لیکن امام پر صرف وحی نازل ہوتی ہے، وہ فرشتے کو نہیں دیکھتا اور چونکہ امام بلاواسطہ اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کرتا ہے اور خود معصوم بھی ہوتا ہے (کوئی غلطی نہیں کر سکتا) اس لیے وہ جو بھی باطنی معنی بیان کرتا ہے یا جو کچھ بھی کہتا ہے وہ منجانب اللہ ہوتا ہے[2]

البتہ ائمہ کی تعداد اور ان کی تعیین کے بارے میں شیعوں میں اختلاف ہے لیکن اکثریت بارہ اماموں کو مانتی ہے جو حسب ذیل ہیں:

(۱) حضرت علیؓ (م ۴۰ھ/۶۶۱ء)
(۲) حضرت امام حسنؓ (م ۴۹ھ/۶۶۹ء)
(۳) حضرت امام حسینؓ (م ۶۱ھ/۶۸۰ء)
(۴) امام زین العابدین (م ۹۵ھ/۷۱۴ء)

---

[1] دیکھئے شیعی اسلام ۱۴۷-۱۵۳؛ دائرہ معارف اسلامیہ (باطنیہ) ۱/۹۴۱ — ۹۴۲
۱۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۵) امام محمد الباقر (م ۱۱۴ھ/۷۳۲ء)

(۶) امام جعفر الصادق (م ۱۴۸ھ/۷۶۵ء)

(۷) امام موسیٰ کاظم (م ۱۸۳ھ/۷۹۹ء)

(۸) امام علی الرضا (م ۲۰۳ھ/۸۱۶ء)

(۹) امام محمد التقی (م ۲۲۰ھ/۸۳۵ء)

(۱۰) امام علی النقی (الہادی) (م ۲۵۴ھ/۸۶۸ء)

(۱۱) امام حسن العسکری (م ۲۶۰ھ/۸۷۴ء)

(۱۲) امام محمد المہدی (ولادت ۲۵۵ھ/۸۶۸ء) ۲۶۰ھ/۸۷۴ء میں کہا جاتا ہے مخفی ہو گئے اور آیندہ ظاہر ہوں گے۔

ان اماموں سے منقول یا منسوب "باطنی تفسیر" نے شیعوں کو قرآن کی اس تفسیر سے کافی حد تک بے نیاز کر دیا جو صحابۂ کرام کے ذریعہ منقول تھی۔

رہا حدیث وسنت کا معاملہ تو شیعوں نے اس دائرہ کو وسیع کر کے امام کے قول وفعل کو بھی حدیث وسنت کا درجہ دے دیا۔ چونکہ ان اماموں کے ہزاروں شاگرد بتائے جاتے ہیں اس لیے ان سے مروی احادیث کا کافی ذخیرہ جمع ہو گیا۔ کسی بھی حدیث کی صحت کے لیے اتنا کافی سمجھا گیا کہ وہ کسی امام تک پہنچا دی جائے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب احادیث بھی بیشتر اماموں ہی کے ذریعہ منقول ہیں۔

اس پس منظر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شیعہ علما کو "علم باطن" کا سہارا کیوں لینا پڑا۔ یعنی یہ کہ انھوں نے اس تمام علمی سرمائے کو رد کر دیا تھا جو صحابۂ کرام کے ذریعے آیا تھا۔ انھیں ماخذ علم کی ضرورت تھی اس لیے انھوں نے اس ضرورت کو "علم باطن" کے ذریعے پورا کر لیا۔ لیکن اس کے اور بھی کئی پہلو قابل توجہ ہیں۔

قرآنی آیات کے اگر ظاہری معنیٰ مراد لیے جائیں یا اس تفسیر کو سامنے رکھا جائے جو صحابہ کے ذریعہ منقول ہے تو شیعہ مذہب کے بہت سے اصولوں بالخصوص عقیدۂ امامت کی تائید نہیں ہو سکتی اس لیے شیعہ علماء نے تاویل کے ذریعہ آیات کے ظاہری معنیٰ سے ہٹ کر ایسے معنیٰ مراد لے لیے جن سے اُن کے عقائد کی تائید ہو سکے۔

لیکن اس قسم کی تاویلات اور معنیٰ عام مسلمان بالخصوص علماء اسی صورت میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قبول کر سکتے تھے جب کہ ان کی تائید قرآن و حدیث سے ہو جاتی اور شیعہ علماء قرآن و حدیث کو معیار بنا نہیں سکتے تھے اس لیے انھوں نے یہ عقیدہ مقرر کر دیا کہ ہر امام پر وحی نازل ہوتی ہے یا الہام ہوتا ہے۔ جو معنی وہ بیان کرتا ہے وہ منجانب اللہ ہوتے ہیں اس لیے اس کے قول کے لیے کسی مزید سند کی ضرورت نہیں رہتی، اس کا فرمایا ہوا مستند ہے بلکہ وہ خود سند ہے۔

اس طرح شیعہ مذہب کے تمام اساسی اور فروعی اصولوں کو صحیح ثابت کرنے اور انھیں عوام میں مقبول بنانے کے لیے ایک مضبوط سند اور ماخذ مل گیا یعنی کسی بھی امام سے منقول یا منسوب قول۔

(باقی آئندہ)

اعلان ملکیت سہ ماہی تحقیقات اسلامی ۔ فارم ۴ رول ۹

۱۔ مقام اشاعت: پان والی کوٹھی ۔ دودھ پور، علی گڑھ یوپی

۲۔ نوعیت اشاعت: سہ ماہی

۳۔ پرنٹر پبلشر: سید جلال الدین عمری

۴۔ قومیت: ہندوستانی

پتہ: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ ۔ یوپی

۵۔ ایڈیٹر: سید جلال الدین عمری

پتہ: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ، یوپی

۶۔ ملکیت: ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی، دودھ پور۔ علی گڑھ، یوپی

بنیادی ارکان کے اسمائے گرامی

(۱) مولانا محمد فاروق خاں (صدر) ۱۳۵۲، بازار چتلی قبر، دہلی ۶

(۲) جناب سید یوسف (رکن) ابوالفضل انکلیو نئی دہلی

(۳) ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی ۔ فریدی ہاؤس سر سید نگر علی گڑھ

(۴) جناب امین الحسن رضوی (رکن) دلشاد گارڈن نئی دہلی۔

(۵) ڈاکٹر محمد رفعت ۔ شعبۂ فزکس ۔ جامعہ ملیہ ۔ نئی دہلی۔

(۶) مولانا کوثر یزدانی ۱۳۵۳ ۔ بازار چتلی قبر ۔ دہلی۔

(۷) ٹی۔ کے عبداللہ صاحب۔ الاتھن کنڈی ہاؤس، ییری کالی کٹ

(۸) ڈاکٹر حمید اللہ ۔ منزل منزل کمپلیکس ۔ علی گڑھ

(۹) ڈاکٹر احمد سجاد ۔ بریا تو ہاؤسنگ سوسائٹی، کالونی طارق منزل رانچی

(۱۰) ڈاکٹر عبد الحق انصاری۔ الریحان منزل منزل، دودھ پور، علیگڑھ

(۱۱) سید جلال الدین عمری (سکریٹری)

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔

مندرجہ معلومات میرے علم و یقین کی حد تک بالکل درست ہیں۔

پبلشر: سید جلال الدین عمری

© rasailojaraid.com